

فیض احمد فیض (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ و تراکیب کی تفہیم

مفہوم	الفاظ
ادھ کھینچا تیر	ناوک نیم کش
پتھر	سنگ
ٹکڑے ٹکڑے دل	دل ریزہ ریزہ
خوشخبری	نوید
وضع داری، البیلا پن، سرکشی	باکپن
ٹیرھا	کج
معالج	چارہ گر
موت کے بعد	پس مرگ
مارے جانے کے قابل	کشتنی
بات جو کہنے کے قابل ہو	گفتنی
وزنی پہاڑ جو اپنی جگہ سے نہ ہلے	کوہ گراں
قربان گاہ	مقل
جدائی	ہجر

شعر نمبر 1:

نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا

جو بچے ہیں سنگ، سمیٹ لو، تن داغ داغ لٹا دیا

تشریح: فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غم دوراں اور غم جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیر تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ ”ہمارے زخمی دل اور جسم بے جاں ہو چکے ہیں۔ اب ان پر مزید تیر چلانے اور پتھر برسانے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم اپنے ادھ کھینچے تیر اور پتھر سنبھال کر رکھ لو۔“

فیض محبوب سے مخاطب ہیں کہ تمہارے تیروں سے ہمارا زخمی دل بے حال ہوتا چلا گیا، دل پر زخم ہوتے چلے گئے، تمہارے تیر دل کو پھور

پُور کرتے چلے گئے یہاں تک کہ تمہارے دیے ہوئے زخموں کی تاب نہ لا کر ہمارا دل بے جان ہو گیا۔ اب اُس میں مزید زخم سہنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ اے محبوب! ہمارے جس دل کو مٹانا چاہتے تھے، تمہارے تیروں نے آخر کار اُسے مٹا دیا ہے۔ اب اس پر مزید تیر چلانے کی زحمت نہ کرو۔ تم تیر چلانے کی تیاری کر رہے ہو۔ کمان پر تیر رکھ کر چلے کو کھینچ رہے ہو، اپنے ادھ کھینچے تیر کو ضائع نہ کرو، تمہارا ہدف یعنی ہمارا دل تمہارے تیروں سے چھلنی ہو کر بے جان ہو چکا ہے۔ اب مزید تیروں کی ضرورت باقی نہیں رہی، جو تیر تم چلانے کے لیے تیار ہو، انہیں سنبھال کر، بچا کر رکھو، کسی اور دل کو زخمی کرنے کے کام آئیں گے۔

آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی

(فیض)

اے محبوب! تم جو پتھر برساتے رہے وہ جسم کو زخمی کرتے رہے، اُن پتھروں کی ضربات نے بالآخر میری جان لے لی ہے، تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، اب جو پتھر تمہارے پاس باقی بچ گئے ہیں، انہیں بچا کر رکھو، انہیں کسی اور طلب گار کے جسم پر برسانا۔
فیض ترقی پسند تحریک کا حصہ اور کمیونزم کے داعی تھے۔ وہ ملک و قوم میں معاشی استحصال اور معاشرتی عدم مساوات کے خلاف آواز اٹھاتے رہے، قیام پاکستان سے جو حقوق و آزادی کے تحفظ کی اُمیدیں وابستہ تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں تو وہ ہم وطن حکمرانوں کے جبر کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ اس کی پاداش میں وہ جیل گئے اور انھوں نے جلا وطنی اختیار کی۔ اُن کے کچھ ہم خیال ساتھی پابند سلاسل ہو کر رہ گئے اور کچھ جاں سے گزر گئے۔ فیض کی اس غزل کے پس منظر میں اُن سرفروش رفقا کی قربانیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔
اس غزل میں وہ محبوب کے پردے میں جابر حکمرانوں سے مخاطب ہیں۔ غزل کی مجموعی فضا سیاسی ہے۔

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سُرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

(فیض)

اس سیاسی پس منظر میں شعر کا مفہوم یوں ہے کہ اے جابر حکمرانو! تم ہماری جاں کے درپے تھے۔ تمہارے سارے ستم، تیر، پتھر، قید و بند کی سختیاں، نفسیاتی حربے، سب کے سب ہمیں حرفِ غلط کی طرح مٹانے اور تمہاری راہ سے ہٹانے کے لیے تھے۔ اپنی راہ سے نہیں ہٹے، تمہارے ستم بڑھتے رہے اور آخر کار ہم نے ارضِ وطن اور اپنے نظریے کے لیے جاں کا نذرانہ پیش کر دیا ہے، وطن پر دل و جاں قربان کر دیے ہیں، اب تمہیں مزید ستم کرنے اور جبر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

گریباں کفن کا تو رہنے دے ثابت
مری خاک سے کیوں تو دامن کشاں ہے

(میر)

شعر نمبر 2:

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمنان کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر، وہ حساب آج چکا دیا

تشریح: فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیر تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی زندگی دے کر دوستوں اور دشمنوں سبھی کے لیے خوشی کے اسباب پیدا کر دیے ہیں۔ میرے دکھوں کا مداوا کرنے والوں کو یہ خوش خبری سنا دو اور میرے قاتلوں کو بھی یہ اطلاع دے دو کہ ہم نے جان دے کر دونوں کا قرض اتار دیا ہے۔

انسان کو جب کوئی پریشانی ہو، وہ کسی دکھ میں مبتلا ہو تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی دوست ہو، کوئی چارہ گر ہو جو میری پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے جو میرے مسائل کا حل، میری الجھنوں کا سلجھاؤ پیش کرے، فیض کے یہاں چارہ گر موجود تو ہیں لیکن وہ چارہ گر کی کرتے دکھائی نہیں دیتے۔

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

فیض کی نظم ”شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں“ میں اس امر کی گواہی ہے کہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جہاں چارہ گری کرنا ممکن نہیں ہوتی، ایسی صورت حال میں چارہ گر بھی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی یہ پریشانی بھی ختم ہوتی ہے جب دکھ درد میں مبتلا فرد جان سے گزر جائے۔ یوں اس کا مرنا چارہ گر کے لیے خوش آئند خبر بن جاتی ہے۔ دوسری طرف قاتل کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا دشمن صفحہ ہستی سے مٹ جائے۔ وہ اپنے دشمن کے ختم ہونے کی خبر کا منتظر رہتا ہے گویا دوست اور دشمن دونوں ایک ہی اطلاع کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں، ہمارا وجود، ہمارا ہونا زندہ رہنا ان کی دین تھا، ہم پر ایک قرض تھا آج ہم نے اپنی جان دے کر یہ قرض اتار دیا ہے۔ حبیب جالب کا کہنا ہے۔

اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

فیض کا موقف یہ ہے ہماری موت اپنوں، پرائیوں، دوستوں اور دشمنوں سبھی کے لیے باعث اطمینان ہوگی وہ جو افتخار عارف نے کہا ہے کہ مصاحبین شہ مطمئن ہوئے۔

کہ سرفراز، سربریدہ بازوؤں سمیت شہر کی فصیل پہ لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے۔
سکون ہی سکون ہے۔

شعر نمبر 3:

کرو کج جبین پہ سر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانگین پس مرگ ہم نے بھلا دیا

(بورڈ 2010)

تشریح:

فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیر تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ میری پریشانی پر کفن کو تھوڑا ٹیڑھا کر دو کہ کہیں میرے قاتل یہ نہ سمجھنے لگیں کہ موت کے بعد ہم نے

عشق کا بانگن یا طنطنہ بھلا دیا ہے۔ کسی انسان کو اس کے موقف سے ہٹانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کہیں روپے پیسے کا لالچ دیا جاتا ہے، کہیں کوئی منصب یا عہدہ رشوت کے طور پر عطا کیا جاتا ہے اور جسے ان دو طریقوں سے نہ خریدا جاسکے اسے ظلم و جبر کے ذریعے دبایا جاتا ہے یا ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فیض کے یہاں حق کے متوالوں کو کوئی ظلم یا جبر حق گوئی سے نہیں روک سکتا وہ جبر میں بھی اختیار پیدا کر لیتے ہیں۔

شہیدانِ وفا کے حوصلے تھے داد کے قابل
وہاں پر شکر کرتے تھے، جہاں پر صبر مشکل تھا
فیض کو اپنے موقف کی سچائی کا پورا یقین ہے اور اس صداقت کا اثر یہ ہے کہ موت بھی سچے شخص کے انداز کو نہیں بدل سکی وہ اپنے قاتلوں کو بھی یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ کفن میں بھی عشق کا بانگن برقرار ہے۔ گویا موت بھی ہمارے جذبے کو شکست نہیں دے سکتی۔ جب انسان ایک بڑے نصب العین کے لیے جان دیتا ہے تو پھر جان دینا ہی اہم نہیں ہوتا۔ جان دینے کا انداز بھی اہم ہو جاتا ہے۔
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آئی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
فیض کفنانے والوں کے مخاطب ہے کہ موت کے بعد پیشانی پر کفن کا کنارہ ٹیڑھا کر دو تا کہ اگر قاتلوں میں سے کوئی ہماری میت پر آئے تو اسے ہماری کج کلاہی سے اندازہ ہو کہ ہمیں اپنے موقف پر ندامت یا شرمندگی نہیں بلکہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہمارے بانگن برقرار ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ فیض کا کہنا ہے۔
سرِ خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

شعر نمبر 4:

ادھر ایک حرف کہ کشتی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

(پورڈ 2010)

تشریح:

فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غم دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیر تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ وہ ہمارا موقف کسی بھی صورت میں سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہمارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے بے شمار باتیں تھیں لیکن انھیں سن کر ان سنا کر دیا گیا اور اگر ہم نے اپنا موقف لکھ کر پیش کیا تو مٹا دیا گیا اور جواباً ایک ہی بات کہی گئی کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

ظلم و جبر اپنے آپ کو منوانے کے لیے سب سے پہلے لوگوں سے آزادی رائے چھین لیتا ہے۔ لوگوں کو بولنے کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

جبر بڑھتا ہے تو صرف زبان پر مہر سکوت ثبت کرنے تک بات نہیں رکتی بلکہ لوگوں کو آزادی تحریر سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے، کیوں کہ لفظ چاہے زبان سے ادا ہو چاہے قلم سے کاغذ پر منتقل ہو، ایک پیغام، ایک نعرہ، ایک تحریک کی صورت اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ ظلم و استبداد تبھی باقی رہ سکتا ہے کہ حق کی آواز بلند نہ ہو اور یہ آواز بلند کرنے والوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ درد کا کہنا ہے۔

اس نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہو گا گر سنا ہو گا

فیض ایسی ہی اک تصویر ہمارے سامنے رکھتے ہیں جس میں بچہ استبداد بے گناہوں کو دبوچے ہوئے ہے۔ جب دلیل کا جواب دلیل سے نہ دیا جاسکے تو پھر نفی قوتیں ہمیشہ حق کی آواز کو خاموش کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ سقراط ہو، سپارٹیکس ہو، حسین ابن علیؑ ہو، پابلو نرودا ہو، محمود درویش ہو، ناظم حکمت ہو، سچ بولنے والوں کے مقدر میں ہمیشہ دار و رسن ہی رہے ہیں۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم نہ جانے کب سے ظلم و جبر کے سائے میں زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خون چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

وہ افراد جنہیں اپنے موقف پر اعتماد ہو وہ موت سے نہیں ڈرتے لیکن یہ احساس تو بہر حال رہتا ہے کہ ہم سے ہماری زبان کیوں چھین لی گئی۔ ہمیں اظہار کی نعمت سے کیوں محروم کر دیا گیا ہے۔ ایسے میں انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

کوئی تو سود چکائے کوئی تو ذمہ لے
اس انقلاب کا جو آج تک ادھار سا ہے

شعر نمبر 5:

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے

رہ یار ہم نے قدم قدم، تجھے یادگار بنا دیا

تشریح: فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غم دوراں اور غم جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیر تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ کوئی بھی مشکل ہمیں اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے پر مجبور نہ کر سکی۔ دوست تک پہنچنے کے راستے میں اگر ہم ٹھہر گئے تو ہماری استقامت پہاڑوں سے بڑھ کر تھی کہ جنہیں اپنی جگہ سے ہٹانا ناممکن ہوتا ہے اور اگر ہم چل پڑے تو چاہے جان سے گزرن پڑا ہم نے پروا نہیں کی پھر موت بھی ہمارا راستہ نہ روک سکی اور یوں ہم نے اس راستے کا چپہ چپہ یادگار بنا دیا ہے۔

زندگی میں ثابت قدمی کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ فرد ہی ثابت قدمی کا مظاہرہ کر سکتا ہے جسے اپنے موقف پر یقین ہو۔ جو کمٹ منٹ یا عہد مندی کے تقاضوں کو پورا کرنا جانتا ہو۔ اس کے لیے بلند ہمتی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ہر اکہ قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی

ہم گھوم پھر کے کوچہ قاتل سے آئے ہیں

فیض رہ و فانیس کسی بھی نوعیت کی کمزوری کا مظاہرہ کرنے کے قائل نہیں۔ ان کے پائے استقامت میں کسی بھی طرح کی لغزش نہیں۔

یہی وجہ ہے وہ اس راستے میں ٹھہر جائیں یا چل پڑیں ان کے لیے زندگی یا موت مسئلہ نہیں بلکہ اپنے راستے پر ثابت قدم رہنا اہم ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ وہ قدم قدم پر اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں۔

مقام فیض کوئی راہ میں چچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کسی فرد سے محبت کا معاملہ ہو یا اپنی سر زمین سے، ایک سچے اور پر خلوص انسان کے لیے محبت کے تقاضوں کو پورا کرنا اہم ہوتا ہے۔ فیض کی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، وطن سے دوری برداشت کی، بیوی بچوں کی جدائی سہی لیکن مصلحت اختیار نہ کی۔ بلکہ وطن سے محبت کا ترانہ ہی آپ کے ہونٹوں پر موجود رہا۔

مری زمیں ہی مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کردے



free ilm.